# اسلامی تمدّن

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی صاحب قبلہ طاب ثراہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ علیٰ سَیِّدِ الْاَنْبِیَآئِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَآلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ۔

اس وقت موضوعِ سخن ''اسلامی تمدن'' ہے۔

اسلامی تمدّن کے پیش کرنے سے پہلے یہ چیز واضح کر دینے کی ہے کہ دنیا کے دوسرے مذاہب میں تمدّن کی دنیا عقائد سے غیر متعلق چیز ہے۔ مگر اسلام کے اصولِ عقائد ہی وہ ہیں جو اسلامی تمدن کی تشکیل کرتے ہیں۔

اسلامی تمدّن کا سرچشمہ چار چیزیں ہیں۔ پہلے لاالٰہ دوسرے اِلَّا اللّٰہ تیسرے رب العالمین چوتھے مالک یوم الدین یعنی آخرت کی جزا وسزا کا تصوّر۔

یہی چار وہ چیزیں ہیں جن سے مل کر پورے اسلامی تمدن کی تشکیل ہوجاتی ہے۔

پہلی چیز جس کا بتانا اسلام کا نصب العین تھا۔ اور وہ لا الہٰ میں مضمر ہے وہ عالم کائنات میں خود انسان کا درجہ اور مقام ہے۔ جب انسان اپنے درجہ کو سمجھ لے گا تو وہ اپنے آئین زندگی کو ایسا ہی رکھے گا۔ جیسا اس کے شایانِ شان ہو اور پست مقاصد میں اپنی زندگی کو رائگاں نہ کرے گا۔

یاد رکھنا چاہئے کہ شئے کی بلندی باعتبار مقصد کے ہوتی ہے۔ جتنا مقصد اونچا ہے اسی تناسب سے وہ شئے اونچی ہے اور جتنا مقصد پست ہے اسی کے لحاظ سے وہ شئے پست ہے۔ کیونکہ یہ یقینی اصول ہے کہ ذریعہ سے مقصد بلند ہوا کرتا ہے لہٰذا اگر انسان نے اپنے مقصد حیات کو پست قرار دیا تو انسان کی زندگی پستی میں آگئی اور جتنا مقصد حیات بلند ہوا اتنی یہ حیات بلند ہوگئی۔ اس کے بعد جس طرح وہ زندگی جس کے مقاصد پست ہوں انسانی رفعت کے خلاف ہے۔ اسی طرح ایسی زندگی جس کا کوئی مقصد نہ ہو۔

اسلام کا کلمہ توحید انہی دونوں باتوں کا سدّ باب کرتا ہے اور اسی میں اس کے تمدن کی تمام رفعت مضمر ہے۔

لا الٰہ کی تعلیم نظر انسان میں بلندی پیدا کرتی ہے کہ وہ پست چیزوں کو مقصد نہ بنائے۔ کیونکہ وہ اس کی انتہائی پست نظری تھی کہ اس نے مادی حیثیت سے پہاڑوں کو اپنے سے اونچا پایا تو ان پہاڑوں کی پوجا کرنے لگا۔ درختوں کو بار آور اور سایہ افگن دیکھا اور اپنے کو ان کا محتاج محسوس کیا تو درختوں کی پوجا کرنے لگا۔ دریاؤں کو دیکھا کہ وہ اس قدر وسعت کے ساتھ فیض پہنچاتے ہیں اور میرے لئے زندگی کی بقا کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ تو دریاؤں کو معبود سمجھ لیا۔ جس حیوان کو دیکھا کہ اس سے مجھے غذا حاصل ہوتی ہے اسی کو اپنا قبلہ بنالیا۔ جب انسان کا کام ہوگیا ہر چیز کی عبادت کرنا تو سب چیزیں اس سے بلند ہوئیں۔ اور یہ سب سے پست ہوا تو اب اس کا کردار اور نظام معاشرہ بھی بلند کیونکر ہوسکتا ہے۔

اسلام کا پہلا کام یہ تھا کہ وہ انسان کو کائناتِ عالم میں اس کا مقام بتائے کہ وہ ہر شئے سے بالاتر ہے۔ کوئی شئے اس سے بلند تر نہیں ہے جب انسان اپنے درجہ کو پہچان لے گا کہ میں کیا ہوں تو پھر پہاڑوں، درختوں اور حیوانوں کی پرستش نہیں کرے گا۔ پھر اپنے کو صاحبانِ دولت، اربابِ سلطنت اور حکام کے

سامنے نہیں جھکائے گا۔ یہ اس کی حقیقی آزادی ہوگی ۔ کیونکہ آزادی درحقیقت یہ نہیں ہے کہ جو دل چاہے وہ کرے بلکہ آزادی یہ ہے کہ سچائی اور حقانیت کے خلاف کسی دباؤ کا اثر نہ قبول کرے۔ یہ وہ روح ہے جولا الٰہ پیدا کرتا ہے۔

لا الٰہ نے ہر معبود و باطل کو مٹا دیا۔ اسی لئے لا الٰہ کہا گیا لاصنم نہیں کہا۔ اگر لاصنم کہا جاتا تو ذہن صرف پتھر، سونے چاندی وغیرہ کے بتوں کی طرف جاتا۔ مگر لا الٰہ کہا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی ایسا نہیں جس کی عظمت کے سامنے انسان کو سر جھکانا درست ہو۔ اس نے ہر الٰہ کی نفی کردی۔ تو جس طرح لات وہبل کے اقتدار کو مٹا دیا۔ اسی طرح نمرود وشداد کو بھی تخت اقتدار سے اتار کر پھینک دیا۔ بلکہ جس طرح خارجی اصنام تخت الوہیت سے معزول ہوئے اسی طرح داخلی اصنام بھی۔ یعنی ہر وہ جذبہ بھی جو حقانیت اور ضمیر کے فیصلہ کے خلاف انسان کو مجبور کرنا چاہے۔ اب جس طرح سرمایہ کی پرستش غلط ہے اسی طرح روٹی کو قبلہ بنانا بھی غلط۔ لذتِ نفس کو اپنا کعبہ بنانا بھی غلط یہ بڑا ہی پوشیدہ صنم تھا جس کا قرآن نے پتہ دیا۔ یہ کہہ کر اَفَرَأَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوَاهُ۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا جس طرح پست شئے کو مقصد بنانا انسان کی رفعت کے خلاف ہے اسی طرح بے مقصد زندگی بھی بے قیمت ہے۔ اس لئے مطلق طور پر لا الٰہ کے اقرار کے بعد پھر ایک مرکز بلند کا تصوّر پیدا کرنا بھی ضروری تھا۔ جو انسان کا نقطہ نگاہ بن سکے۔ یہ اگر نہ ہو تو خارجی اصنام سے جب آزاد ہو جائے گا تو داخلی اصنام میں گرفتار ہو جائے گا۔ جیسے قرآن کی یہ آیت کہہ رہی ہے ''کیا تم نے انہیں بھی دیکھا جو اپنی خواہش نفس کو اپنا الٰہ بنائے ہوئے ہیں''۔

اس تصور کو لا الٰہ کے بعد الا اللہ نے قائم کیا۔ انسان کا معبود اور کوئی نہیں مگر بس اللہ کی ذات ہے۔ جو اس کا معبود اور مقصد عمل بن سکتی ہے۔

اللہ کا تعارف جس طرح کرایا گیا اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اس کی بندگی انسانی آزادی کی روح ہے کیونکہ جیسا پہلے کہا گیا صحیح آزادی یہی تو ہے کہ انسان اپنے سچے ضمیر کے فیصلہ کے مطابق جو صحیح اور درست طریقِ عمل ہو اس کو اختیار کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔ اور اللہ کون ہے؟ **اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۔**

''وہ'' وہ ہستی ہے جو عدل و احسان اور جن جن سے جو قرابتیں ہیں ان کے احترام پر مامور کرتی ہے اور حدود حقوق سے قدم آگے بڑھانے، فتنہ وفساد برپا کرنے اور نفسانی خواہشوں کی بدلگامی سے تم کو روکتی ہے''۔

اس سے ظاہر ہوا کہ اللہ کی بندگی ضمیر انسانی کے تقاضوں کے خلاف کوئی بارنفس پر عائد نہیں کرتی۔ حقیقت میں یہ بندگی ہر اس بندھن سے آزادی کا باعث ہے جو انسان کو خود اپنے ضمیر کے خلاف غلط راستوں کی طرف لے جانے پر مجبور کیا کرتی ہے۔

ان میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اللہ عدل کو پسند کرتا ہے۔ وہ عادل کو دوست رکھتا ہے۔ اس طرح افراد انسانی میں اجتماعی حقوق کا تصوّر قائم کیا اور ظلم وستم کے دروازے بند کئے۔

وہ ضمیر کے خلاف صرف نفسانیت کا تقاضا ہوتا ہے کہ جب ہم صاحب اقتدار ہیں تو پہلے اپنی ذات کو فائدہ پہنچائیں۔ پھر اپنے بھائی کو، پھر اپنے ہمسایہ کو، پھر اپنے دوستوں اور دور کے عزیزوں کو۔ اب اس میں کچھ اور افراد کو چاہے نقصان پہنچ جائے لیکن اللہ کی رضا جوئی کا پہلا نتیجہ عدل ہے۔

اب اگر آپ جج کی کرسی پر ہیں اور آپ کے سامنے دو فریق ہیں ان میں ایک حقیقی بھائی ہے اور ایک غیر ہے اور روئداد مقدمہ سے ثابت ہو گیا کہ حق غیر کے ساتھ ہے اور اپنا بھائی ناحق پر ہے۔ تو ہوائے نفس یہی کہتی ہوگی کہ بھائی کے حق میں فیصلہ کیا جائے۔ لیکن خدا پرستی کا تقاضا یہ ہوگا کہ غیر کے حق میں فیصلہ کیجئے۔ چاہے بھائی کے خلاف ہو جائے۔ یہ امتحان ہے خدا پرستی وخود پرستی کا۔ جو خود پرست ہوگا۔ وہ کرسئ اقتدار پر آکر صرف اپنے بھائیوں کو فائدہ پہنچائے گا۔ چاہے حق ان کے خلاف ہو۔

یہ وہی نظریہ ہے جو اہل جاہلیت کا تھا۔ ''اُنْصُرْ اَخَاکَ ظَالِماً اَوْ مَظْلُوْماً'' اپنے بھائی کی مدد کرو۔ چاہے ظالم ہو اور چاہے مظلوم'' اس کے مقابلہ میں اسلام کا پیغام یہ تھا کہ حق کا ساتھ دو۔ چاہے بھائی کے ساتھ ہو یا غیر کے ساتھ۔

رسول اللہ صلعم نے اس مفہوم کو ذہن نشین کرنے کے لئے ایک دفعہ فقرہ وہی عرب جاہلیت کا لے لیا اور معنی بدل دیئے۔ کسی شخص نے آپ کے سامنے ذکر کیا کہ عرب کا یہ مقولہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا میں بھی یہی کہتا ہوں کہ ''اُنْصُرْ اَخَاکَ ظَالِماً اَوْ مَظْلُوْماً'' اپنے بھائی کی مدد کرو۔ چاہے ظالم ہو، چاہے مظلوم''۔ یہ شخص جانتا تھا کہ آپ کی تعلیم اس جاہلی نظریہ کے خلاف ہے۔ اس لئے وہ حیرت کی نگاہ سے آپ کی جانب دیکھنے لگا۔ رسالتمآبؐ نے فرمایا۔ کہ اگر تمہارا بھائی ظالم ہے تو اس کی مدد یہ ہے کہ اس کے ہاتھ کو ظلم سے روک دو اور اگر مظلوم ہو تو مدد یہ ہے کہ اس سے ظلم کو دفع کرو۔

اسلامی تمدّن کا اجتماعی تعلقات میں یہ پہلا اصول ہے۔ ''اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ'' ''اللہ عدل کا حکم دیتا ہے'' ''اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ'' وہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا''۔ یہ عدل کا اصول اس وقت کارفرما ہوگا جب کسی شخص کے سامنے دو آدمی ہوں۔ اور ان میں آپس میں جھگڑا ہو۔ اس کے بعد دوسری صورت یہ ہے کہ خود اس شخص اور کسی دوسرے کے درمیان بات پڑ جائے اور غیر کا معاملہ ہو۔ تو اس وقت خواہش نفس کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم اپنا مطلب حاصل کریں۔ چاہے حق ہمارا نہ بھی ہو، یہ تو عدل ہی کے خلاف ہے۔ جو پہلا اصول ہے لیکن ہم اگر بہت اصول کے پابند ہیں تو یہ چاہیں گے کہ جب حق ہمارا ہے تو ہم اسے ضرور ہی حاصل کرلیں۔ اس موقع کے لئے تمدن اسلامی ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور وہ ہے احسان کا حکم جسے عدل کے بعد ذکر کیا ہے۔ ''اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ''۔

مطلب یہ ہے کہ اپنے حق سے تجاوز نہ کریں۔ یہاں تک تو عدل ہے اس کا لحاظ تو بہرحال ضروری ہے۔ مگر جب تم خود صاحب حق ہو، اور تمہارا معاملہ غیر کے ساتھ پڑ گیا ہو تو بہتر یہ ہے کہ دوسرے سے عدل کے مطالبہ کو بھی نظر انداز کردو اور اپنا حق اس کی خاطر چھوڑ دو۔ یہ ہوگا احسان اسی بناء پر مقتول کے ورثا کو قصاص کا حق دینے کے بعد بھی کہا گیا کہ ''اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ'' اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے''۔ اس کے بعد جہاں تک عدل کی شرط کو پورا کرنا ہے، دوسروں کے حقوق کا معاملہ ہے اور احسان کی دعوت دی گئی ہے وہاں قرابتوں اور رشتوں کے پاس ولحاظ اور حسنِ سلوک میں ترجیحی خصوصیات کے لحاظ کی بھی دعوت دی گئی ہے اور اس کے لئے ارشاد ہوا۔ ''اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبیٰ'' اس طرح اصول تمدّن ترتیب کے ساتھ یہ قائم ہوئے:

(۱) عدل: جس کا لحاظ حقوق غیر میں ناگزیر ہے۔

(۲) احسان

(۳) ذوی القربیٰ کے ساتھ خصوصی حسن سلوک

اب یہ قرابت کا تصوّر فقط مادی نقطۂ نظر سے ہوتا تو وہ بہت محدود ہے۔ مگر اسلام نے اس میں بھی وسعت پیدا کی ہے۔ مادی رشتوں سے قرابت بھی بہرحال قرابت ہے۔ مگر اس سے آگے کچھ اور دائرے قرابت کے بھی انسان کو بتادیئے۔ جس میں سے ایک دوسرے کو محیط ہے اور اس کی وجہ سے نگاہِ مسلم میں بین العالمی آفاقیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اس وسعتِ نگاہ کی بنیاد وصفِ الٰہی رب العالمین پر ہے کہ جس پر اسلام نے بہت زور دیا ہے۔

مادی اعتبار سے جب انسان تعلقات قائم کرے گا، تو اپنی ذات سب سے زیادہ قریب محسوس ہوگی۔ پھر وہ کہ جن جن سے اپنی ذات کے براہِ راست رشتے ہیں۔ جیسے ماں، باپ اور اولاد، پھر احباب ہمسائے اور شناسا یہ وہ رشتے ہیں جو اپنی ذات کو بیچ میں رکھ کر قائم ہوتے ہیں اور چونکہ اپنی ذات محدود ہے۔ لہٰذا ان رشتوں کا تصوّر زیادہ سے زیادہ چار پانچ پشتوں میں عزیز داری پیدا کرتا ہے۔ سلسلہ اس سے آگے بڑھا تو پھر انسان کوئی

عزیزداری محسوس نہیں کرتا اور ایک منزل ایسی آتی ہے کہ الفت و محبت کا کوئی سبب معلوم نہیں رہا۔

اسلام نے انسان کو یہ تصور پیدا کرایا کہ جب وہ اپنی ذات سے آگے بڑھے تو سب سے پہلے یہ سوچے کہ میرا پیدا کرنے والا اور میرا پروردگار کون ہے؟ اس طرح خط قرابت ادھر ادھر پھیلنے کے بجائے ایک دم بلندی کی طرف چلا گیا۔ اب ادھر جاکے اگر اس کی نگاہ کے سامنے صرف خالق کے صفات جمال و کمالِ ذات ہی رہ گئے تو یہ ان جلوؤں میں ایسا کھوئے گا کہ یہ اب خلق کی طرف رجوع ہی نہ کرے گا اس لئے کہ وجوب وجود کے کمالات کی بجلی اس کی نگاہوں کو ایسا خیرہ کردے گی کہ وہ ممکنات کو لاشئے محض سمجھ لے گا۔ اب اس کی نظر میں کوئی آتا ہی نہ ہوگا۔ اسی طریق تصوّر کا نتیجہ ہوا رہبانیت۔ اب انسان پہاڑوں پر نکل گیا۔ بیوی بچوں سے قطع تعلق کیا۔ جنگلوں میں بے سروسامان پھرنے لگا۔ اس طرح یہ فرد اپنی نوع سے کٹ کر الگ ہوگیا۔ یہ خالق کے مقصد کے خلاف ہے۔ اس نے اسے نوعِ انسان میں پیدا کیا ہے۔ تو وہ اسے اس کل کا ایک فائدہ رساں جز رکھنا چاہتا ہے۔

اس کے لئے اسلام نے اللہ کے کمال ذات کے تصوّر کے ساتھ فوراً بلا فاصلہ ذہن کو ادھر منتقل کیا۔ کہ اس کا رشتہ کن کن سے ہے۔ اب اگر اس کا رشتہ صرف ایک خاندان سے ہوتا تو نگاہ اس خاندان پر جاتی اگر ایک ملک سے ہوتا تو نگاہ اس ملک پر پڑتی۔ مگر وہ تو ہے لامحدود اس لئے اسلام نے اس کا تعارف کرایا کہ الحمدللہ رب العالمین اس طرح بتایا کہ اللہ تمام عالمین کا پروردگار ہے اب اللہ کے ذریعہ سے اس شخص کا رشتہ تمام کائنات سے قائم ہوگیا اور چونکہ خداوند عالم تمام عالمین سے یکساں تعلق رکھتا ہے اس لئے اس کے ذریعہ سے جو رشتہ قائم ہوا اس میں اپنے عزیز اور غیر۔ اپنے دوست اور دشمن کی کوئی تفریق نہیں رہی۔ اسی لئے اللہ کی اس ربوبیت کا علم بلند کرنے کے لئے جو سب سے بڑا رسول بھیجا گیا۔ اس کا دائرۂ عمل یہی بتایا کہ "وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ" ہم نے تم کو تمام عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے' اگر وہ کسی ملک کے لئے ہوتا تو ایسی تعلیم دیتا جو اس ملک کو فائدہ پہنچائے۔ وہ تو تمام خلق کے لئے تھا۔ اس لئے اس نے تعلیم بھی وہ دی جو تمام خلق کو اخوت اور مساوات کی کڑی میں پرودے۔

ہم دنیا کے لیڈروں کو دیکھتے ہیں کہ جس ملک میں گئے وہاں والوں کی طبیعت کے مطابق باتیں کہنے لگے۔ ہمارے یہاں کا کوئی سفیر ایران جائے تو وہ وہاں یہی بیان کرے گا کہ ہمارے تعلقات ایمان کے ساتھ کتنے قدیم ہیں۔ اگر عراق جائے تو وہاں عراق کے ساتھ اپنے قدیم تعلقات کا تذکرہ کرے گا۔ مگر یہ پیغمبرؐ اسلام تھے کہ عرب کے اندر بیٹھ کر یہ اعلان فرمارہے تھے کہ "لَا فَخْرَ لِلْقَرَشِي عَلیٰ غَیْرِ الْقَرَشِيِّ وَلَا لِلْعَرَبِيِّ عَلیٰ غَیْرِ الْعَرَبِيِّ کُلُّکُمْ اَوْلَادُ اٰدَمَ" کوئی فخر نہیں قرشی کو غیر قرشی پر اور عرب کو غیر عرب پر۔ تم سب آدمؑ کی اولاد ہو۔'' اس اعلان کی اتنی قیمت اس وقت نہ ہوتی کہ جب آپ ایران تشریف لے گئے ہوتے اور وہاں کسی تقریر میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے ہوتے۔

آج دنیا مساوات، مساوات کے نعرے لگارہی ہے۔ مگر یہ قانونی مساوات کس کام کی۔ جس کا پس منظر دماغ کے اندر کچھ نہیں۔

دنیا چاہتی ہے کہ مساوات سے اخوت قائم کرے حالانکہ صحیح اصول یہ ہے کہ پہلے احساسِ اخوّت پیدا ہو اور اخوّت سے مساوات قائم ہو کیونکہ مساوات ایک خارجی عمل ہے اور اخوت ایک اندرونی تصور ہے جب تک اندرونی دنیا میں احساس اخوّت پیدا نہ ہوگا۔ مساوات کی جو عمارت کھڑی کی جائے گی وہ بے بنیاد ہوگی۔

اب سوال یہ ہے کہ اخوّت کیونکر قائم ہو۔ تو اس کی بنیاد ہے وہی۔ جسے رب العالمین کے لفظ سے اسلام نے پیش کیا۔ کیونکہ اخوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی کثرت کسی وحدت کی طرف

منسوب ہوجائے۔ یہاں تک کہ سگے بھائی اسی لئے بھائی ہیں کہ وہ ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔

اسی طرح ایک برادری کے افراد ایک مورثِ اعلیٰ کی نسل کے اشخاص ہیں۔ ہم وطن، ایک دیس کے رہنے والے اور یہاں تک کہ اب دنیا سمت آفتاب کی وحدت کو مرکز بتائے ہوئے ہے۔ اور مسائل پر یوں غور ہوتا ہے کہ کون مشرق کے لئے مفید ہے اور کون مغرب کے لئے۔

اب اگر کوئی مرکز ایسا سامنے آجائے جو مشرق اور مغرب کے فرق کو بھی دور کردے تو وہ تمام اہلِ عالم کے لئے معیار اخوّت بن جائے گا۔ اس مرکز کا قرآن نے پتہ دیا۔ یہ کہہ کر ''رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ'' اللہ ہی مشرق کا پروردگار ہے اور اللہ ہی مغرب کا بھی پروردگار'' ''لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ والْمَغْرِبُ'' ''پورب اور پچھم دونوں اسی کے ہیں۔ اس طرح تمام عالم کے آخری مرکز کو بتادیا اور جب کہ دنیا اس چودھویں صدی میں مشرق اور مغرب پر تقسیم ہوگئی ہے تو اس کے بعد دنیا کے ارتقاء کا قدم یہی ہوسکتا ہے کہ وہ مشرق و مغرب میں بھی ایک نقطۂ مشترک کا تصوّر کرلے اور وہ دونوں کے پروردگار کی ذات ہے۔

اور رب العالمین کا تصوّر تو اس کے بھی آگے ہے۔ دنیا آج مریخ تک پہنچنے کی کوشش کررہی ہے۔ دوسرے سیّارات میں بھی آبادیوں کے انکشاف کی فکر ہے۔ پھر یہ تو اس نظامِ شمسی کے اجزا ہیں۔ اس کے آگے دوسرے سورج اور پھر ان کے نظامات اور ان کے سیّارات میں آبادیوں کا امکان۔ مگر جہاں جہاں بھی مخلوق بستی ہو وہ عالمین کے دائرہ سے باہر کبھی نہیں جاسکتی جہاں تک قرآن نے اسلامی اخوت کے دائرہ میں پہلے سے وسعت کا پتہ دے دیا ہے۔

مریخ ہو یا چاند یا کوئی اور سیّارہ۔ بلکہ اس کے آگے کسی نظامِ شمسی کا کوئی جز جہاں بھی پہنچ جاؤ وہاں اسی پروردگار کی خدائی ہوگی اور وہاں کے رہنے والے اس کے رشتہ سے تمہارے بھائی ہوں گے۔

اس طرح اسلام نے وحدتِ خالق کو اتحادِ خلائق کا ذریعہ قرار دیا۔ اور اسی معیار پر حقوق اللہ کے ساتھ حقوق الناس توام قرار دیئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک غزوہ پر تشریف لئے جارہے تھے حضرت مرکب پر سوار ہوچکے ہیں۔ رفقائے سفر بہت سے روانہ ہوچکے ہیں کہ ایک عرب نے لجام فرس کو ہاتھ سے پکڑ کر کہا۔ ''اَخْبِرْنِیْ عَنِ الدِّیْنِ کُلِّهٖ'' مجھے پورا دین بتا دیجئے۔ اس وقت کے علمائے اسلام میں کوئی ہوتا تو اول تو اس کے علم میں اس سوال کی سمائی نہ ہوتی۔ وہ فوراً سوچنے لگتا کہ اس سوال کے جواب میں کئی سو صفحوں کی کتاب لکھنا ہوگی اور پھر اخلاق میں اتنی وسعت نہ ہوتی۔ بھلا سفر کا ہنگام، روانگی کا پورا سامان اور اس وقت یہ عظیم الشان سوال! یقیناً تیوریوں پر بل آجاتے اور کہا جاتا کہ بھلا یہ وقت اس مسئلہ کے پوچھنے کا ہے۔ لیکن وہاں ایک طرف علمی اقتدار یہ تھا کہ دریا کوزہ میں بند کیا جاسکتا تھا۔ اور دوسری طرف اخلاق میں وسعت اتنی تھی کہ پیشانی پر شکن نہ آئی۔ آپ نے جواب دیا۔ اس جواب کو سننے سے پہلے پھر وقت کی نزاکت کا اندازہ کرلیجئے۔ یعنی سفر درپیش ہے۔ رفقاء روانہ ہوچکے ہیں۔ رسولؐ بھی مرکب پر سوار ہیں۔ تو اب اس وقت جو جواب دیا جائے گا اس میں کوئی جز غیر ضروری تو قطعاً نہیں ہوسکتا۔

اب ملاحظہ ہو کہ رسولؐ کیا جواب دیتے ہیں؟ سوال تھا کہ ''اَخْبِرْنِیْ عَنِ الدِّیْنِ کُلِّهٖ'' پیغمبر خدا جواب دیتے ہیں:

''الطَّاعَةُ لِلْخَالِقِ والشَّفَقَةُ علیٰ الْمَخْلُوْقِ'' پورا دین یہ ہے ''اللہ کی اطاعت اور مخلوق پر شفقت''۔

بس یہی تمدن اسلامی ہے۔ یہی وہ دین ہے جو ہزاروں صفحوں کی کتابوں میں بیان ہوسکتا ہے اور اسی کو حضرت پیغمبر خدا نے ایک فقرہ میں بیان فرمادیا اس میں تمام اصول معاشرت ہیں۔ اس میں حقوق دوستاں بھی ہیں اور حقوق دشمناں بھی۔ حقوق موافقین بھی ہیں اور حقوقِ مخالفین بھی۔ حقوقِ یگانگاں بھی

ہیں، اور حقوقِ بیگانگاں بھی۔

آج دنیا میں انسانی حقوق کا چرچا ہے۔ منشور حقوق انسانی مرتب ہوا ہے اور اسی کی بنا پر معاہدات ہورہے ہیں۔ مگر اس کی بنیاد چودہ سو برس پہلے حضرت محمد عربیؐ کے ہاتھ سے قائم ہوئی۔ انہوں نے حقوقِ انسانی کا منشور تمام حدود و تفصیلات کے ساتھ شائع کردیا۔ اور اپنے عمل سے جیتی جاگتی شکل میں دکھا دیا۔ اور بتادیا کہ انسانی حقوق کیا ہوتے ہیں اور وہ کس طرح ادا ہوتے ہیں۔

مکّہ کی وہ پر آشوب زندگی جو ۱۳ سال کی طویل مدت میں بسر ہوئی، اسی زندگی کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک عورت روزانہ حضرت کے سرِ مبارک پر جب آپ اس راستے سے گزرتے تھے خس وخاشاک یعنی گھر کا کوڑا کرکٹ پھینک دیا کرتی تھی۔ یہ روز کا معمول تھا۔ حضرت نے اس سے کوئی تعرض نہ کیا اور نہ وہ راستہ ترک کیا۔ چند دن ایسے گزر گئے کہ یہ واقعہ پیش نہیں آیا۔ حضرت راستے سے گزرتے رہے اور وہ کوڑا جو پھینکا جاتا تھا پھینکا نہ گیا۔ اب حضورؐ نے لوگوں سے دریافت کیا کہ یہاں ایک عورت رہتی تھی۔ وہ ہمارے سر پر روزانہ کوڑا کرکٹ پھینکتی تھی، وہ کہاں گئی؟ لوگوں نے عرض کیا کہ وہ کئی روز سے بیمار ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ہمیں اس کا گھر بتادو کہ ہم اس کی عیادت کرلیں۔ لوگوں نے گھر بتادیا۔ حضرتؐ اس کے گھر تشریف لے گئے۔ عورت نے جب حضرت کو دیکھا تو اپنی پست خیالی سے کہا کہ تم اس وقت مجھ سے بدلا لینے آئے ہو جب میں بیمار ہوں! حضورؐ نے فرمایا کہ اے کنیز خدا! میں بدلا لینے نہیں آیا ہوں۔ بلکہ یہ سن کر تم بیمار ہو تمہاری عیادت کو آیا ہوں۔ نتیجہ کو نہ دیکھئے کہ وہ بعد میں مسلمان ہوگئی۔ یہ دیکھئے کہ جب آپ عیادت کو تشریف لے گئے ہیں اس وقت تو وہ کافرہ تھی۔ تو یہ عیادت کو جانا کون سے حق کا ادا کرنا تھا۔ حق ایمانی تو اس کا کوئی تھا نہیں۔ ماننا پڑے گا کہ یہ حق انسانی تھا جو ادا کیا جارہا تھا۔ یعنی ایک انسان کا حق دوسرے انسان پر یہ ہے کہ وہ اس کے دکھ درد میں کام آئے اور اس کے ساتھ ہمدردی کرے۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ حاتم طائی کی بیٹی حضور کی خدمت میں آتی ہے تو آپ اس کی تعظیم کو کھڑے ہوجاتے ہیں اور اپنی عبا کو اس کے لئے فرش کردیتے ہیں۔ لوگ بعد میں کہتے ہیں کہ حضور یہ تو کافرہ ہے۔ آپ نے اس کے ساتھ یہ برتاؤ کیوں کیا؟ حضرتؐ نے فرمایا کہ ''اَکْرِمُوْا کَرِیْمَ کُلِّ قَوْمٍ'' ہر قوم میں جو صاحبِ اوصاف افراد ہوں ان کی عزت کرنا چاہئے'' معلوم ہوا کہ یہ حق انسانی ہے حق ایمانی نہیں ہے۔

پھر مہمان کے لئے صاف کہا گیا کہ ''اَکْرِمُوا الضَّیْفَ وَلَوْ کَانَ کَافِراً'' ''مہمان کی خاطر داری کرو چاہے وہ کافر ہو'' معلوم ہوا کہ یہ بھی حق انسانی ہے۔

اسلام میں دو وصف قابل عزت ہیں۔ ایک مسلم اور دوسرے مومن، اور بنص قرآن مومن کا درجہ مسلم سے بلند ہے قرآنِ مجید میں ہے:۔ ''قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ'' یہ صحرائی عرب آکر کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ کہو کہ تم ایمان نہیں لائے ہو۔ ہاں یہ کہو، کہ ہم اسلام لائے۔ ایمان تو ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے'' معلوم ہوا کہ اسلام آسان ہے، ایمان مشکل ہے۔ مسلم کا درجہ پہلے حاصل ہوجاتا ہے اور مومن کا درجہ بعد کو حاصل ہوتا ہے۔ اب ایک حدیث میرے پیشِ نظر ہے۔ جو مسلم کے بارے میں ہے اور ایک حدیث مومن کے بارے میں ہے۔ مسلم کے بارے میں یہ حدیث ہے کہ ''اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ یَدِہٖ وَ لِسَانِہٖ'' ''مسلمان وہ ہے کہ جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں''۔ اور مومن کے بارے میں یہ حدیث ہے کہ ''اَلْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَ جَارُہٗ بَوَائِقَہٗ'' ''مومن وہ ہے کہ جس کے خطرہ سے اس کے پڑوسی مطمئن رہیں'' اب ظاہر ہے کہ پڑوسی کے معنی کسی قوم وملّت کے نہیں ہیں۔ یہ حقوق انسانی ہیں جن کا ادا کرنا رکن ایمان ہے۔

مساوات یعنی مشترک حقوق میں خاندانوں اور شخصیتوں کے فرق کو نظر انداز کرنا اس میں سب سے مشکل خود اپنی ذات کے ساتھ مساوات برتنا ہے۔ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے اس کی جو مثال پیش فرمائی ہے وہ تاریخ عالم میں بے نظیر ہے ۔ حضرت مرض الموت میں مبتلا ہیں اور اسی عالم بیماری میں اعلان ہوتا ہے کہ مسلمان مسجد میں جمع ہو جائیں ۔ حضرت خطبہ ارشاد فرمائیں گے۔ مسلمان جمع ہو جاتے ہیں۔ حضرت مسجد میں خطبہ ارشاد فرماتے ہیں اور اس میں ارشاد ہوتا ہے کہ عنقریب میں داعیٔ الٰہی کی صدا پر لبّیک کہوں گا اور تم سے رخصت ہو جاؤں گا تو تم میں سے جس کو میرے ہاتھ سے کوئی ایذا پہنچی ہو وہ مجھ سے بدلا لے لے ۔ یہ سن کر مجمع میں سے سوادہ بن قیس ایک شخص کھڑے ہو گئے اور کہا کہ ایک دن حضور ناقہ پر سوار تھے اور کہیں تشریف لئے جا رہے تھے ناقہ نے چلنے میں کچھ کمی کی۔ حضورؐ نے تازیانہ کو جنبش دی۔ میں قریب سے گزر رہا تھا وہ تازیانہ میری پشت پر پڑ گیا۔ مجھے یہ ایذا آپ کے ہاتھ سے پہنچی ہے۔

اس دعوے کی نوعیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مستغیث کے بیان میں خود مستغاث علیہ کی صفائی موجود ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ حضور کا ارادہ ناقہ کو تنبیہ کرنے کا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس شخص کی خود خطا ہو کہ یہ تازیانہ کی زد پر آ گیا ہو۔ کسی اور کے خلاف اگر یہ استغاثہ ہوتا تو یقین ہے کہ خود استغاثہ کے بیان پر اسے بری قرار دے دیا جاتا مگر چونکہ دعویٰ خود آپؐ کے خلاف تھا۔ آپ نے جائز صفائی بھی پیش نہیں فرمائی اور بلالؓ سے فرمایا کہ جا کر ہمارا وہ تازیانہ لے آؤ۔ بلالؓ تازیانہ لائے۔ حضرتؐ نے تازیانہ اس شخص کی طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ یہ تازیانہ حاضر ہے ۔ اپنا بدلا لے لو۔ سوادہ نے کہا ۔ کہ جب حضور کا تازیانہ میری پشت پر پڑا تھا تو میرے جسم پر پیراہن نہ تھا۔ اس لئے مجھے اذیت زیادہ ہوئی تھی ۔ حضرتؐ نے اپنی پشت مبارک پر سے پیراہن ہٹا دیا اور فرمایا جس طرح تم کو ایذا پہنچی تھی اسی طرح مجھے پہنچاؤ۔ اب وہ شخص پشت مبارک کے بوسے لینے لگا اور کہا میری کیا مجال ہے جو اس جسم کو تازیانہ سے مس کروں۔ حضرت نے فرمایا یہ مروّت کا محل نہیں ہے۔ یا تو بدلا لو یا کہو کہ میں نے معاف کیا۔ اس شخص نے رو رو کر کہا کہ میں نے آپ کو معاف کر دیا تب حضرت کو تسکین ہوئی۔

یہ ہے اسلامی تمدن کا خاکہ اس کے اجزاء پر پھر غور کر لیجئے۔ کائنات کی کوئی شئے معبود نہیں۔ اس لئے کسی کے سامنے سر جھکانا نہیں۔ ہاں ایک تمہارا معبود ہے جو عدل و احسان اور ہر طرح کے رشتوں کے قیام و تحفظ کا طلبگار اور ہر قسم کے ظلم و ستم، بے اعتدالی اور سیاہ کاری سے مانع ہے۔ اس کی عبادت کرنا چاہئے اور اس کی بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اخلاقی و اجتماعی حدود و قیود کا پابند رہے، اور اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور پھر وہ ہمارا پروردگار تمام عالمین کا پروردگار ہے اس لئے ہمارا بلا تفریق رنگ، نسل و وطن وغیرہ تمام افراد بشر سے رشتہ ہے اور ان کے مفادات کے تحفظ کے ہم ذمہ دار ہیں۔

اس داغ بیل پر کسی نظام معاشرہ کی داغ بیل پڑے تو کیا دنیا کا کوئی فرد اس سے پریشان ہوسکتا ہے؟ مگر واقعہ یہ ہے کہ اسلامی تمدّن کے نام سے اکثر و بیشتر جو نمونے پیش ہوئے وہ قیصریت و کسرویت یا فرعونیت و شدادیت سے بس تھوڑے ہی مختلف تھے۔ ان میں ''شاہنشہیت'' کا اتنا غلبہ تھا کہ دنیا دینِ اسلام سے بدظن ہوگئی اور اس لئے وہ نظامِ اسلامی کے نام سے تھرا جاتی ہے۔

نظامِ اسلامی میں حاکم کے فرائض کتنے سخت ہوتے ہیں۔ اسے حضرت علی بن ابی طالبؑ کے ان الفاظ میں دیکھئے جو انہوں نے مالک اشتر کو مصر کا حاکم بناتے وقت لکھے تھے۔ فرماتے ہیں:

''میں تم کو ایسی جگہ حاکم بنا کر بھیج رہا ہوں جہاں مختلف مذہب و مسلک کے لوگ رہتے ہیں۔'' یاد رکھو تم پر ان سب کے حقوق کی ذمہ داری ہے۔ ''لِاَنَّهُمْ اِمَّا اَخٌ لَکَ فِی الدِّیْنِ اَوْ نَظِیْرٌ لَکَ فِی الْخَلْقِ'' اس لئے کہ وہ جس مذہب کے بھی ہوں

(بقیہ۔۔۔۔۔۔۔صفحہ ۲۸ پر)

قانون کے حسن وخوبی کو سمجھ بھی چکا ہو۔ جب بے داغ کردار کا مالک اپنے قانون کو دنیا کے سامنے پیش کرے گا تو اس کی لفظیں کھوکھلی دیواریں نہ ہوں گی بلکہ گراں قدر حقیقتیں اور قلوب میں اعتراف حسن قانون کے مستحکم قلعے ہوں گے۔ اگر غور کیا جائے تو ہماری ظاہری نگاہیں آئندہ کی زندگی کا مطالعہ نہیں کرسکتی ہیں زیادہ تر افراد ایسے ہوتے ہیں جن کو براہ راست قانون کے حسن وخوبی، اس کی اہمیت وضرورت کا پورا احساس نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود ایسے افراد کسی قانون کو تو تسلیم نہیں کرتے، اور کسی قانون کو تسلیم کر لیتے ہیں؟ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ اگر مہلک قانون کسی ایسے شخص نے پیش کیا جو اپنی سابقہ زندگی میں انتہائی پاک وصاف زندگی کا مالک تھا تو عوام اپنے گذشتہ خوشگوار تجربہ کی بنا پر تسلیم کر لیتے ہیں اور اگر کسی ایسے فرد نے کسی نظام کی طرف دعوت دی جس کی سابقہ زندگی مشکوک و ناقابل اطمینان گذری ہے چاہے وہ قانون کیسا ہی عمدہ، جامع، ہمہ گیر، اور مفید کیوں نہ ہو، لیکن مسترد کر دیا جاتا ہے۔ کیوں کہ عوام کی ذہنیتوں پر جو عکس موجود ہے، وہ براہ راست قانون پر اثر انداز ہوتا ہے، اور لوگ مفید قانون سے محروم ہوجاتے ہیں اس میں عوام بے چارے مجبور بھی ہیں، کیوں کہ قانون کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے کا سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب قانون کی طرف دعوت دی جارہی ہو اس وقت ہم کو معلوم نہیں کہ آئندہ یہ داعی قانون اور مبلغ نظام کس ذمہ داری سے اپنے فرائض کو انجام دے گا یہ تجربہ تو اسی وقت ہوگا جب ہم نظام کو تسلیم کر کے اس کو اپنے امور کا منظم سمجھ لیں (یا نفاذ قانون میں کوتاہی کرے گا) لہٰذا سوائے اس کے کوئی صورت آئندہ تصور کریں ماضی کے خوشگوار تصورات کے ہاتھوں میں مستقبل کی تقدیر دے دیں یہی وجہ ہے کہ جب کوئی نظام اپنا کسی کو نمائندہ بنا کر عوام کے رجحانات کو اپنی طرف مبذول کرانا چاہتا ہے اور اپنے موافق آرائے عامہ کے حصول کا خواہاں ہوتا ہے تو ہمیشہ کسی ایسے کو اپنا نمائندہ مقرر کرتا ہے جو پہلے سے عوام میں مقبول ہو اور عوام کا فرض اولین یہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے ہر نمائندہ کی سابقہ زندگی کا جائزہ لیں، ماضی کا مطالعہ کریں سابقہ تعلقات پر نظر ڈالیں جس کے سابقہ کردار قابل اطمینان پائیں فوراً اس کے ہم خیال ہوجائیں لہٰذا معلوم ہوا کہ ہر نظام کے محافظ ومبلغ کو جس طرح اس زمانے میں کہ جب وہ محافظ قانون ہے انتہائی محتاط وذمہ دار ہونا چاہئے اسی طرح سابقہ زندگی میں بھی بیداغ اور پاک وصاف، قابل اطمینان ہونا چاہئے۔



**بقیہ.......... اسلامی تمدن**

بہرحال یا تو تمہارے دینی بھائی ہوں گے اور یا تمہاری ہی طرح اللہ کے مخلوق ہوں گے۔ خدا ان سب کے حقوق کے بارے میں تم سے باز پرس کرے گا"۔

پھر اسی مکتوب میں اس سوال کا جواب دیا ہے جو آج ہر ملک کی با اقتدار طاقت کی طرف سے اس ملک کی اقلیت کے سامنے پیش ہوتا ہے کہ ہم کیونکر یقین کریں کہ تم وفادار رہوگے۔ آپ فرماتے ہیں:

"لٰكِنْ حُسْنَ ثِقَتِكَ بِهِمْ بِمِقْدَارِ حُسْنِ صَنِيْعِكَ مَعَهُمْ"۔

"تمہارا اعتماد اپنی رعایا کی وفاداری پر اتنا ہونا چاہئے جتنا تمہارا سلوک ان سے اچھا ہو۔"

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ ان سے پوچھنے کی بات نہیں ہے کہ تم وفادار رہوگے یا نہیں۔ بلکہ یہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنے کی چیز ہے کہ آپ کا سلوک ان کے ساتھ کیسا ہے۔

جو تمدّن افرادِ خلق کے اندر اس فرض شناسی، حدود شناسی اور حقوق شناسی کے ساتھ قائم ہو وہ تمدن اسلامی ہوگا۔ ورنہ نام چاہے جو کچھ رکھ لیجئے اور کاغذ پر اس کے دستور میں کتنی ہی خوشنما باتیں لکھ دیجئے اس معاشرہ اور تمدّن کا اسلام سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ 